بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

بالآخر وہی ہوا جس کا دھڑکا اس ملک کے تمام ہی خواہوں کو مدت سے لگا ہوا تھا کہ انتخابات غیر جانبدارانہ اور منصفانہ نہیں ہوں گے اور وہ ووٹ کے ذریعہ اپنے حکمرانوں کو تبدیل کرنے میں ناکام رہیں گے۔ عوام کے یہ اندیشے بے بنیاد نہ تھے بلکہ بعض ٹھوس وجوہ کی بناء پر انہیں یہ خدشات لاحق تھے۔ اُن میں پہلی وجہ انتقالِ اقتدار کے بارے میں پاکستان میں کسی اچھی اور صحت مند روایت کا فقدان تھا۔ اِس ملک کے قیام کے بعد یہاں جو شخص بھی مسندِ اقتدار پر قابض ہوا اُس نے زیادہ سے زیادہ مدت تک اِس سے چمٹے رہنے کی کوشش کی اور کبھی خوشدلی کے ساتھ رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے اِس سے الگ ہونے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔ اُس نے جب بھی اِس مسند کو چھوڑا تو عوامی دباؤ کے تحت اور ذلت و رسوائی کے ساتھ ہی چھوڑا۔ قوموں کی زندگی میں اچھی روایات شاہراہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس قوم کے پاس صحت مند روایات کا بیش قیمت سرمایہ موجود ہو، وہ قوم کسی تصادم اور زیان کے بغیر اپنی منزل کی طرف گامزن رہتی ہے اور جو قوم اِس سرمایہ سے محروم ہو جاتی ہے اُس کی بیشتر صلاحیتیں باہمی سر پھٹول میں ضائع ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ہمارے حکمرانوں نے چونکہ ووٹ کے تقدس کو پامال کر کے دھاندلیوں کے ذریعہ اقتدار حاصل کیا ہے، اِس بنا پر اِس ملک کے عوام اِس امانت کی غیر معمولی اہمیت اور قوت سے پوری طرح آشنا نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اِس شبہ میں گرفتار رہے کہ آیا وہ ووٹ کی مدد سے اپنے حکمرانوں کو تبدیل کر سکتے ہیں؟ حالیہ انتخابات میں برسرِ اقتدار طبقے کی طرف سے جس وسیع پیمانے پر دھاندلیاں ہوئی ہیں، اُنہوں نے ووٹ کی فیصلہ کُن اہمیت کے بارے

میں عوام کے خدشات کو تقویت پہنچاتی ہے۔

جمہوریت پر لوگوں کے اعتماد کو مجروح کرنے والی دوسری چیز مسٹر بھٹو کا اپنا مزاج ہے۔ عوام کی نظروں کے سامنے اُن کی سیاسی زندگی کے تین اَدوار ہیں۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب کی کابینہ میں ایک رُکن کی حیثیت سے، پیپلز پارٹی کے قائد کی حیثیت سے اور پھر سربراہِ مملکت کی حیثیت سے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ زبان کی حد تک تو جمہوریت کا دعویٰ کرتے رہے ہیں، لیکن عمل کا ہر میدان اُن کے دعوے کی پوری شدت سے تکذیب کرتا ہے۔ جب تک وہ فیلڈ مارشل صاحب کے ساتھ رہے، وہ نہ صرف اُن کے ہر قول اور فعل کی، خواہ وہ کتنا ہی جمہوریت کش تھا، تائید کرتے رہے، بلکہ اُنھیں غیر جمہوری راستے اختیار کرنے کا مشورہ دیتے رہے۔ اُنھوں نے اپنے دَورِ وزارت میں فیلڈ مارشل صاحب کو یہ بات سجھائی کہ کنونشن لیگ کی تنظیم تو اِس انداز پر کی جائے کہ ضلع کا ڈپٹی کمشنر اِس سیاسی جماعت کا صدر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس اِس کا سیکرٹری ہو۔

کابینہ سے نکلنے کے بعد جب اُنھوں نے ایک نئی سیاسی جماعت کی تشکیل کی تو اُس کا پورا ڈھانچہ آمریت کی اساس پر استوار کیا گیا۔ اِس جماعت کی طرف سے عوام کو جو نعرے دیے گئے اُن میں خطرناک تضاد پایا جاتا ہے اور اُس کا سارا کاروبار انتخابات کے ذریعہ نہیں بلکہ نامزدگیوں کے بل بوتے پر چلایا جاتا رہا ہے۔ پیپلز پارٹی کی جدّوجُہد کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات بادنیٰ تامّل سمجھ میں آسکتی ہے کہ پوری جماعت کی غرض و غایت بجز اِس کے اور کچھ نہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت کو ہر طریقہ سے غیر معمولی طور پر اُبھارا جائے۔ اِس سیاسی جماعت کی غلط نشوونما کا نتیجہ یہ ہے کہ پوری تنظیم ایک مقتدر شخصیت کا محض اشتہار معلوم ہوتی ہے اور اگر وہ شخصیت اِس سے الگ کر دی جائے تو اِس کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔ اِس جماعت کی تشکیل و تنظیم اِس انداز پر کی گئی ہے اور اِس کی سعی و جُہد کا نہج اِس طرح متعیّن کیا گیا ہے کہ صرف ایک شخص کا قد کاٹھ ہی غیر معمولی طور پر نمایاں ہو اور باقی افراد اُس کے سامنے بالکل بونے نظر آئیں اور جماعت میں ہر دوسرے شخص کا مرتبہ و مقام بھٹو صاحب کی غیر مشروط اطاعت اور چاکری کی نسبت سے مشخص کیا جائے۔ اِن حالات میں عوام یہ سوچنے پر مجبور

تھے کہ جو شخص اپنی سیاسی جماعت میں جمہوریت کا وجود گوارا نہیں کر سکتا وہ ملک کے اندر جمہوری اداروں کو کس طرح پھلتے پھولتے دیکھ سکتا ہے؟

سازش اور ہنگامہ آرائی کے ذریعہ جب یہ شخص تختِ اقتدار پہ فائز ہوا تو اُس نے ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جو سراسر آمرانہ تھا۔ اُس نے تختِ اقتدار پر متمکن ہو کر ایوان سے ایسے مطالبات منوانے شروع کیے جن کے برملا اظہار کی کبھی آمروں کو بھی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اُس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ اگرچہ ووٹوں کے ذریعے ملک کا سربراہ بنا ہے، مگر اُسے اُمورِ سلطنت چلانے کے لیے مارشل لاء درکار ہے اور اسمبلی کو اُس کے اِس مضحکہ خیز مطالبے کے سامنے با دلِ نخواستہ جھکنا پڑا۔ اِس کے کچھ عرصہ بعد اگرچہ بھٹو صاحب نے آئینی طور پہ اپنی حیثیت بدل لی مگر اُن کے مزاج اور اطوار میں قطعاً کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ اُنہوں نے ملکی آئین کا، جو پاکستانی عوام کی اُمنگوں کا بڑی حد تک ترجمان تھا، ایسا حلیہ بگاڑا کہ اُس کی جمہوری رُوح بالکل ختم ہو کر رہ گئی۔ حزبِ اختلاف کی راہ میں ایسی مشکلات کھڑی کر دی گئیں کہ اُس کے لیے اپنے فرائض کا انجام دینا بالکل ممکن نہ رہا۔ عوام سے تحریر و تقریر کی آزادی اور اجتماع کا حق سلب کر لیا گیا، صحافت پر مختلف قسم کی ناروا پابندیاں عائد کی گئیں جن کی وجہ سے بیشتر اخبارات سرکاری خبر نامے بن کر رہ گئے۔ دفعہ ۱۴۴ کے مسلسل نفاذ نے سیاسی زندگی کو بالکل معطل کر کے رکھ دیا۔ الغرض حکومت نے ہر وہ کام کیا جس سے جمہوری عمل رُک جائے اور ملک پہ ایک پارٹی کی نہیں بلکہ ایک شخص کی آمریت جمہوریت کے عنوان سے مسلط ہو جائے۔

اِن حالات میں جب سات جنوری کو ملک میں عام انتخابات کا اعلان کیا گیا تو عوام نے اُسے محض ایک ڈھونگ سمجھا اور انتخابی سرگرمیاں شروع کرنے کے بجائے کچھ دن اس انداز پر سوچتے رہے کہ کیا انتخاب کے اِس ڈرامہ میں حصّہ لینا ملک و ملت کے لیے کچھ نتیجہ خیز بھی ہوگا یا نہیں؟ بھٹو صاحب کا آمرانہ مزاج اور اُن کا جمہوریت کُش طرزِ عمل اُن کے سامنے تھا۔ اسی لیے وہ انتخابات کے ہنگاموں میں شریک ہونے کے بارے میں بڑے متامّل تھے۔ لیکن قومی اتحاد کے معرضِ وجود میں آنے سے اُن کی ہمت بندھی اور وہ یک زبان ہو کر ووٹ کے ذریعہ حکومت کو تبدیل کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہوئے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اُنہیں بھٹو صاحب کے آمرانہ رجحانات کا پہلے سے اندازہ

تھا۔ وہ اپنے ملک کی نوکر شاہی کے طرزِ فکر سے بھی کسی حد تک واقف تھے، اِس لیے سو فیصد منصفانہ انتخابات کی اُنہیں قطعاً توقع نہ تھی۔ لیکن اِن سارے موانع کو پوری طرح نگاہ میں رکھنے کے باوجود اگر اُنہوں نے انتخابات میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا، تو محض اِس بنیاد پر کیا کہ مسٹر بھٹو منصفانہ انتخابات کے انعقاد کی جو بار بار سوگند کھا رہے ہیں اُس کا کچھ تو پاس کریں گے اور اپنے ضمیر کی خلش کی وجہ سے نہ سہی، دوسری اقوام کی حرف گیری سے بچنے کے لیے اور ملکی وقار کی خاطر اِس طرح کی کھلی دھاندلیوں سے مجتنب ہی رہیں گے جن سے پاکستان کے انتخابات پوری دُنیا میں اُن کی ذات اور مُلک و ملت کی رسوائی کا باعث بنیں۔ جس شخص کو اپنی عزت کا ذرا بھی احساس ہوتا ہے، وہ اگر بد دیانت بھی ہو تو ایسی بد دیانتی کرنے سے گریز کرتا ہے جس سے اُس کی عزت ہی معرضِ خطر میں پڑ جائے۔ اِسی مسلّمہ حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر عوام یہ سوچتے تھے کہ بھٹو صاحب بلاشبہ اقتدار کے انتہائی حریص ہیں اور اِس کے حصول کی خاطر وہ ہر چیز داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں، لیکن دھاندلیوں کے معاملے میں وہ اِس سطح پر اُترنے کے لیے اغلباً آمادہ نہ ہوں گے جس سے بین الاقوامی برادری میں اُن کی ساکھ بالکل گر جائے۔

عوام کے اِس فیصلے کی دوسری بڑی وجہ انتظامیہ کی اخلاقی گراوٹ کے بارے میں اُن کا غلط اندازہ تھا۔ وہ اِس امر سے تو بخوبی واقف تھے کہ انتظامیہ اب اپنی منصبی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے بجائے حکمران جماعت کی منظورِ نظر بننے کے لیے کوشاں رہتی ہے اور اِس مقصد کے لیے وہ بسا اوقات ایسی اخلاق سوز حرکات کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتی ہے جن کا انسان تصوّر نہیں کر سکتا۔ لیکن اِن تلخ حقائق کو جاننے کے باوجود عوام کا ذہن یہ باور کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا کہ ساری نوکر شاہی برسرِ اقتدار طبقہ کی شہ پا کر عدل و انصاف کے بنیادی تقاضوں کو پوری ڈھٹائی کے ساتھ نظر انداز کر دے گی اور اپنے منصب کے وقار کو بے دریغ قربان کرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔ سرکاری ملازم حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بالعموم تگ و دَو کرتے ہی رہتے ہیں اور بعض اوقات اِس تگ و دَو میں اُن سے کچھ زیادتیاں بھی سرزد ہو جاتی ہیں، لیکن وہ وسیع پیمانے پر کوئی ایسی دھاندلی کرنے سے ڈرتے ہیں جس سے اُن کا مستقبل بالکل تاریک ہو کر رہ

جائے کیونکہ انہیں ہر لمحہ اس بات کا احساس رہتا ہے کہ حکومتیں تو بدلتی رہتی ہیں ۔ اس لیے انہیں کوئی ایسی گھناؤنی حرکت نہ کرنی چاہیے جو بعد میں ان کے لیے وجہ پریشانی بن جائے ۔ اس بناء پر ہر دانشمند سرکاری ملازم گو حکمران طبقہ کی نظر کرم کا خواہشمند ہوتا ہے ، لیکن کوئی ایسا انتہا پسندانہ طرزِ عمل اختیار کرنے سے ہمیشہ گریز کرتا ہے جس سے نئی حکومت کی نظروں میں اس کی حیثیت مشکوک ہو کر رہ جائے ۔ صدارت وزارت تو عارضی مناصب ہیں اور سول سروس اِن کی نسبت زیادہ پائیدار ملازمت ہے ۔ اِس لیے کوئی معقول سول سرونٹ عارضی مناصب پر فائز افراد کی خاطر اپنی مستقل ملازمت کو خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہوتا مگر افسوس ، اِن انتخابات میں نوکر شاہی نے اِس معقول اور دانشمندانہ روش کو چھوڑ کر ایک ایسا عاقبت نا اندیشانہ رویہ اختیار کیا ہے جو نہ صرف اُن کے اخلاقی افلاس پر دلالت کرتا ہے ، بلکہ اُن کے ذہنی دیوالیہ پن کا بھی ثبوت بہم پہنچاتا ہے ۔ اُنہوں نے کوتاہ نظری سے اپنی قسمت کو ایک سیاسی جماعت سے وابستہ کر کے ایک ایسا جانبدارانہ رویہ اختیار کیا ہے جو اُن کے لیے اور بعد میں آنے والی انتظامیہ کے لیے بڑی مشکلات پیدا کرے گا ۔ ظاہر بات ہے جب موجودہ نوکر شاہی پیپلز پارٹی کا ایک فریق بن کر اُس کے لیے ہر جائز و ناجائز کام کرنے کو اپنا کمال سمجھتی ہے ، تو دوسری سیاسی جماعتیں اُسے کس طرح بھروسے کے قابل سمجھیں گی ؟ کیا اقتدار کی تبدیلی کے بعد بھی اِس نوکر شاہی کی موجودہ حیثیت قائم رہے گی ؟

نامساعد حالات کو پوری طرح جاننے کے باوجود قومی اتحاد نے اگر انتخابات میں حصہ لیا تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پاکستان اور بھارت دونوں ممالک کے برسرِ اقتدار طبقے چونکہ اپنے جمہوریت کُش طرزِ عمل سے دُنیا میں کافی حد تک بدنام ہو چکے تھے ، اِس لیے انتخابات کے اعلان کے بعد عوام میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ ان لوگوں نے نئے انتخابات کرانے کا یہ فیصلہ اِس لیے کیا ہے تاکہ اِس جمہوری عمل کے ذریعہ وہ اپنی جماعتوں اور ملکوں کی گرتی ہوئی ساکھ بحال کر سکیں ۔ لہٰذا وہ ایسی کارروائیاں کرنے کی جرأت نہ کریں گے جن سے اُن کی گرتی ہوئی ساکھ بحال ہونے کے بجائے خاک میں مل کر رہ جائے ۔ پاکستان میں اِس تاثر کو بھٹو صاحب کے اُن بیانات نے بھی تقویت پہنچائی جن میں وہ بڑے فخر

کے ساتھ ہر مقام پر اور ہر محفل میں دہرا رہے تھے کہ انہوں نے انتخابات کا پہلے اعلان کر کے جمہوریت کے میدان میں ایسی پیش قدمی کی ہے کہ بھارت کی سربراہ مسز اندرا گاندھی اُن کی تقلید میں وہاں انتخابات منعقد کرانے پر مجبور ہو گئی ہیں۔ اس اعلان سے عوام کے اندر یہ خیال پیدا ہوا کہ انتخابات کا یہ اہتمام جسے بھٹو صاحب بھارت کے لیے قابلِ تقلید ٹھیرا رہے ہیں ایسے بھونڈے انداز کا تو نہ ہو کا جس سے پوری دنیا میں اُن کی اور پاکستان کی رسوائی ہو۔ مگر افسوس کہ عوام کے اندازے بالکل غلط ثابت ہوئے۔ انتخابات میں بھارت سے پیش قدمی کرنے والا ملک اور اس کا حکمران وسیع پیمانے پر دھاندلیوں کی وجہ سے بدنام ہوئے اور تقلید کرنے والی مملکت اور اس کی سربراہ جمہوری روایات کا احترام کر کے دنیا میں سربلند اور نیک نام ہوئیں۔ انہوں نے گزشتہ دو سالوں میں انسانی حقوق کو پامال کر کے اپنی شہرت کو جس قدر داغدار کیا تھا، منصفانہ انتخابات کی مدد سے اُس کی کافی حد تک تلافی کر لی ہے، جبکہ ہمارے حکمرانوں نے انتخابات میں شرمناک ہتھکنڈے استعمال کر کے ملک و ملت کو اِس حد تک بدنام کیا ہے کہ ہم شرم کے مارے کسی قوم کے ساتھ اپنی آنکھیں چار کرنے کے قابل نہیں رہے۔

اِن انتخابات کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ بھٹو صاحب ایک طرف تو ووٹ کا تقدس پامال کر کے محض انتظامیہ کی اندھی بہری قوت کے بل بوتے پر مسندِ اقتدار پر قابض ہوتے ہیں اور دوسری طرف وہ اِس بات کے بھی طالب ہیں کہ ملک کے عوام ایک جمہوری سربراہ کی حیثیت سے اُن کا احترام کریں اور انہیں دل کے گوشے میں وہ جگہ دیں جو عام طور پر رائے عامہ کی ترجمان شخصیتوں کو دی جاتی ہے۔ رائے عامہ کے علی الرغم اگر وہ محض فوج، ایف ایس ایف، پولیس اور نوکر شاہی کی قوت سے عوام کی گردنوں پر مسلط رہنے کا تہیہ کر چکے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ اپنے دعوائے جمہوریت سے یکسر دست بردار ہو جائیں اور اپنے آپ کو برملا ایک آمر کی حیثیت سے دُنیا کے سامنے پیش کریں۔ اُن کے مزاج، اُن کی گذشتہ پانچ برس کی کارروائیوں اور خود اپنی جماعت کے اندر اُن کے غیر جمہوری طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے کوئی عقل کا اندھا ہی انہیں "جمہوریت نواز" کا خطاب دے سکتا ہے۔ ایک معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ بھٹو صاحب اِس ملک

کو بڑی سرعت کے ساتھ ایک بدترین قسم کی آمریت کی طرف لے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افراد کی آزادیاں سلب کر کے اُنہیں اجتماعیت کی جکڑ بندیوں میں کسا جا رہا ہے۔

آمریت کی تفصیلات کو اگر نظر انداز کر کے اُس کے بنیادی نقاط پر غور کیا جائے تو وہ صرف چار ہیں:

— ملک کا نظم ونسق عوام کی رائے اور تائید سے چلانے کے بجائے حکمران کی ذاتی رائے بلکہ خواہش کے مطابق چلایا جائے۔

— ایک سیاسی جماعت ہی اقتدار پر بلا شرکت غیرے قابض ہو اور یہ جماعت بھی ایک ہمہ مقتدر شخصیت کی بے ضمیر باندی ہو جو اُس کے اشارۂ ابرو پر ہر وقت رقص کرنے کے لیے تیار ہو۔

— ملک کا انتظام عوام کے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے عوامی نمائندے نہیں بلکہ حکمران کے مفاد کی بنیاد پر بڑے ظالمانہ انداز سے جابر نوکر شاہی چلائے۔

— تنقید اور احتساب کے سارے راستے مسدود کر دیے جائیں اور قوم کے سارے وسائل ایک مرکزی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے بے دریغ استعمال کیے جائیں۔

یہ ہیں آمریت کی چند بنیادی خصوصیات۔ اب دیکھیے کیا ہمارے ملک کا نظامِ حکومت اِن خصوصیات کا حامل نہیں ہے؟ کیا شخصِ واحد کی ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لیے پوری قوم کو ظلم و استبداد کی بے رحم چکی میں پیسا نہیں جا رہا؟ کیا یہاں کے عوام کا یہ مطالبہ کسی لحاظ سے غیر معقول اور ملک کے لیے کسی اعتبار سے بھی خطرے کا باعث ہے کہ اس ملک کے حکمران اُن کی آزادانہ مرضی سے منتخب ہوں اور وہ نظامِ اسلامی قائم کرنے کے پابند بھی ہوں کیونکہ یہ ملک بے شمار قربانیاں دے کر اسلام اور صرف اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے؟ لہٰذا اس مملکتِ خداداد میں اسلام کے علاوہ کسی "ازم" کو پَر پُرزے نکالنے کا موقع نہیں دیا جا سکتا

اب اگر بھٹو صاحب اِس ملک میں "سوشلزم" قائم کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ انہوں نے انتخابات کے بعد ہی غیر ملکی اخبار نویسوں کو بتایا ہے تو پھر اُنہیں "اسلام ہمارا دین ہے" اور "جمہوریت ہماری سیاست ہے" کے پُر فریب نعرے چھوڑ دینے چاہییں۔ اُنہیں کھُل کر یہ کہنا چاہیے کہ میں ملک پر آمرانہ نظام اِس وجہ سے مسلط کر رہا ہوں تاکہ یہاں اشتراکیت کے نیام (باقی بر صفحہ ۴۸)